مرزا غالب اور صفیر بلگرامی: مشابہتیں اور تضادات

ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

پوسٹ اجرا، وایا ریام فیکٹری، ضلع مدھوبنی (بہار)، موبائل: 9910509702

غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نام ور شاعر و ادیب اور صاحب فن تھے۔ وہ جسم و جثہ کے اعتبار سے تو یکہ و تنہا تھے، مگر وہ اپنی متنوع ادبی و شعری خدمات کی وجہ سے ایک انجمن اور ایک ادارہ کہلانے کے مستحق تھے، وہ دلی اور لکھنؤ دونوں ادبی دبستانوں کا سنگم تھے، یہ الگ بحث کا موضوع ہے کہ ان کی شاعری پر لکھنؤ اور دلی میں سے کس کا رنگ زیادہ گہرا تھا، مگر انھوں نے دونوں ادبی مراکز کی نمایاں خصوصیات کو اپنی شخصیت میں جذب کیا تھا، اس کے ساتھ انھوں نے دبستان عظیم آباد کی ادبی خصوصیات کو بھی اپنی شخصیت میں رچا بسا لیا تھا، کیوں کہ وہ آرہ اور ریاست بہار کے دوسرے ممتاز مقامات و اضلاع کی خاک میں کھیل کود کر پروان چڑھے تھے، انھیں سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا، یہی شوق انھیں دہلی، لکھنؤ اور کان پور و بنارس بھی لے گیا اور بہار کے مشہور اماکن و اضلاع: مظفر پور، دربھنگہ، چھپرہ، مونگیر، بھاگل پور، پورنیہ اور پٹنہ تک کھینچ کر لے گیا۔ وہ بیک وقت تین ادبی دبستانوں کے نمائندہ شاعر کہے جاسکتے ہیں۔

صفیر نے بھی باضابطہ استادی اور شاگردی کے سلسلے سے اپنے کو وابستہ کیا، تاکہ وہ شعر و ادب کی دنیا میں بے استاد نہ رہیں، انھوں نے نہ صرف مرزا دبیر سے شاگردی کا سلسلہ قائم کیا، بلکہ اپنی شاعری اور فن کو جلا بخشنے کے لیے اردو زبان کے سب سے بڑے فلسفی شاعر مرزا غالب کا در بھی کھٹکھٹایا اور ان سے اصلاح لی، مگر صفیر کا مرتبہ کائنات ادب و شاعری میں صرف اس لیے بڑا نہیں ہے کہ وہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا غالب کے شاگرد تھے، بلکہ صفیر اس لیے اردو شعر و ادب میں اہم غزل گو شاعر شمار کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے شاعری اور نثر نگاری کی تمام اصناف میں کام یاب طبع آزمائی کی تھی۔ وہ غالب کے شاگرد ضرور تھے، جس پر انھیں فخر و ناز بھی تھا، مگر انھوں نے استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ صرف اصلاح سخن کے لیے قائم کیا تھا۔ اپنے قد کو اونچا کرنا اور استاد کے نام و نمود کا فائدہ اٹھا کر شہرت کی منزل طے کرنا ان کا مقصود و مطلوب نہ تھا۔

صفیر بلگرامی ایک کشادہ ذہن کے شاعر تھے، وہ کئی دبستانوں کا نمائندہ کہلانا چاہتے تھے اور عموماً یہ ہوتا ہے کہ شعرا ایک دبستان سے وابستگی کے بعد تعصب یا تقلید میں دوسرے شعری رجحانات سے کلی یا جزوی منحرف ہوجاتے ہیں، مگر وہ ایک فراخ دل شاعر و شخص تھے، انھوں نے کسی ایک کھوٹے سے اپنے آپ کو باندھنا پسند نہیں کیا۔ وہ نہ تو کسی دبستان کی وابستگی سے گریز کرتے ہیں اور نہ ہی مختلف الطبائع اساتذہ کی طرف انتساب سے احتراز کرتے ہیں، بلکہ اپنے تمام اساتذہ اور محسنین کا برملا اعتراف ایک فارسی قطعے میں کرتے ہیں، اول وہلہ میں اس قطعہ سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ صفیر نے صرف فارسی کلام پر غالب سے اصلاح لی تھی، مگر سچی بات یہ ہے کہ فارسی ہی نہیں، انھوں نے اردو کلام پر بھی غالب سے اصلاح لی ہے۔ اس کا اندازہ غالب اور صفیر کے درمیان مراسلت و مکاتبت سے بھی ہوگا:

استاد من بشیوۂ اردو بود سخن
کز ناسخ است یافتہ تمغائے شاعری
در مرثیہ دبیر بود اوستاد من
مقبول کبریا شدہ از مدح حیدری
غالب بود ہنرورِ شعرم بپارسی
کوہست در زمانہ علم با ہنروری

یہی وجہ ہے کہ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر ظفر اوگانوی کی کتاب کے آغاز میں مندرج اپنی مختصر رائے میں لکھتے ہیں:

''بیک وقت وہ لکھنؤ اور دلی کے دو مختلف دبستانی میلانات سے اثر قبول کر رہے تھے۔ ایک طرف دبیر و ناسخ کے اثرات تھے اور دوسری طرف غالب کی شاگردی تھی، لیکن صفیر بلگرامی زیادہ دور تک کسی ایک راہبر کا ساتھ نہیں دے سکے۔''(۱)

صفیر بلگرامی کا پورا نام سید فرزند احمد صفیر تھا، والد کا نام سید عبدالحی عرف میر سید احمد تھا۔ وہ ۲۷؍ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ مطابق ۷؍اپریل ۱۸۳۴ء کو اپنی ننھیال مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ بلگرامی سادات کے ایک ممتاز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، مگر ان کے پردادا کے والد سید خورشید علی بلگرام سے آکر آرہ (بہار) میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب ۴۲ واسطوں سے محمد رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے۔ شیر خواری کا عرصہ گزارنے کے بعد، وہ

دو سال کی عمر میں اپنی ددھیال بلگرام (ضلع ہردوئی) آ گئے اور مالک رام کے مطابق پانچ برس کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ صفیر آرہ میں مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے تھے اور اس کے بعد آرہ کا ہی روڑا بن کر رہے۔ خود صفیر اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

''سید فرزند احمد صفیر حسینی واسطی بلگرامی شاگرد سحر لکھنوی و دبیر لکھنوی و غالب دہلوی عرض کرتا ہے ۱۲۴۹ھ میں میری ولادت مقام مارہرہ ضلع ایٹہ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں بلگرام ہوتا ہوا والدین کے ساتھ قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد میں آیا۔'' (۲)

کئی پشتوں سے صفیر کے گھر میں شعر و ادب کا چرچا تھا۔ اتفاق سے مادری اور پدری دونوں سلسلۂ نسب میں علم و فضل کا شہرہ رہا تھا۔ شاعری تین پشتوں سے وراثت میں منتقل ہو رہی تھی۔ صفیر بلگرامی شاعر ابن شاعر ابن شاعر تھے۔ پردادا، دادا اور والد سبھی نہ صرف شاعری کرتے تھے، بلکہ شعر و سخن کا عمدہ، شستہ اور معیاری ذوق بھی رکھتے تھے اور یہی ادبی وراثت صفیر کو بھی ورثہ میں ملی تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں صفیر کے بعد جوش ملیح آبادی ہی ایسے شاعر گزرے ہیں، جن کے خاندان میں تین پشتوں سے شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔

ابتدائے سن میں ہی صفیر کے ادبی جوہر کھلنے لگے تھے۔ حافظہ اتنا غیر معمولی اور یادداشت اتنی مضبوط تھی کہ بچپن اور نوعمری کے سارے واقعات لوح دل پر نقش بر حجر کی طرح مرتسم تھے، یہاں تک کہ ختنہ اور رسم بسم اللہ تک کی ساری باتیں انھیں یاد تھیں۔ سات سال کی عمر میں باضابطہ مکتب میں پڑھنا لکھنا شروع کر دیا۔ جو کچھ بھی سنتے اس کو اپنی یادداشت والی ڈائری میں نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ یہی ادبی میلان تھا کہ ۹ رسال کی عمر میں ہی تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہو گیا۔ اپنے ایک گھریلو نابینا بہاری ملازم کی زبانی مشہور زمانہ قصہ گل بکاؤلی سنا تو اس کہانی کے سارے واقعات، کردار اور مضامین اس طرح ان کے ذہن نشیں ہو گئے کہ اس کو سننے کے بعد قلم بند بھی کر لیا۔ وہ مکتب میں بھی اپنی سخن دانی اور ادبی ذوق کا اظہار کرنے لگے تھے۔ اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ نثر و نظم کے مسائل اور خوبیوں پر مکالمہ اور مباحثہ کی مجلس میں حصہ لینے لگے تھے اور اسی عمر میں خوش خطی کی مشق بھی کر لی تھی۔

انھوں نے ساری عمر آرہ اور بہار میں گزاری اور یہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ موت ہیضہ سے ہوئی، مگر وہ موت بھی ایسے مہینے میں آئی کہ ہر کسی کو ایسی موت پر رشک آئے۔ ماہ رمضان المبارک میں ۱۱ رمئی ۱۸۹۰ء کو پٹنہ میں وفات پائی، مگر ان کی نعش کو براہ خشکی آرہ لے جایا گیا، جو کئی پشتوں سے ان کا وطن اصلی رہا تھا اور وہیں میر گنج قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انھوں نے کل ۵۷ رسال ۹ رماہ اور ۲۱ ریوم کی عمر پائی۔

صفیر ایک کثیر التصانیف مصنف تھے، مگر ان کی تصنیفات کی تعداد کے معاملے میں محققین کے مابین بڑا تنازع رہا ہے۔ ان کے ایک شاگرد نواب تجمل حسین خاں نے ان کی تصانیف کی تعداد ۶۹۷ ربتائی ہے، جب کہ صفیر نے اپنی سوانح عمری میں اپنی تصنیفات کی جو مجموعی تعداد بتائی ہے، وہ ۹۵۲ کے عدد کو پہنچتی ہے اور صفیر کے پوتے عنایت احمد بلگرامی نے ۳۸۶ رکی تعداد بتائی ہے، نقوش کے آپ بیتی نمبر میں ان کی تصانیف کی تعداد بشمول مکاتیب و متفرقات ۶۲ ردرج کی گئی ہے۔ ایک محقق نے تو بڑی جرأت سے کام لیا اور صفیر کی تصانیف کی تعداد کو اتنا کم کر دیا کہ ان کی بسیار نویسی اور زود گوئی کو دیکھ کر یک گونہ حیرت ہوتی ہے، ان کم نظر محققین نے تصانیفِ صفیر کو ۲۰ رکے عدد میں محدود کر دیا، جو خلاف واقعہ ہے، مگر جہاں تک ۶۹۷، یا ۹۵۲ کی بات ہے، تو یہ عددی تکثر اس لیے ہے کہ صفیر نے ایک رباعی اور ایک صنف کو بھی مستقل تصنیف کے خانے میں رکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر ظفر اوگانوی صفیر تصانیف کے حوالے سے ابھرنے والے اس اختلاف کے مابین تطبیق و تصفیہ کی راہ تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل صفیر کے شاگرد تجمل حسین خاں اور خود صفیر بلگرامی نے متذکرہ تعدادِ تصانیفِ صفیر میں تصانیف کو نہیں بلکہ اصناف سخن، مختصر رسالوں اور خطوط کی تعداد کو تصانیف گردان کر یہ لمبی فہرست تیار کر ڈالی ہے۔'' (۳)

صفیر کی حیات و خدمات پر لکھی گئی کتابوں اور مقالوں کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی محقق نے صفیر کی تصانیف کی حتمی اور یقینی تعداد درج نہیں کی ہے۔ نہ تو مشفق خواجہ نے تعداد کا تعین کیا ہے اور نہ ہی صفیر پر اتھارٹی کی حیثیت رکھنے والے ظفر اوگانوی اس حوالے سے کوئی دوٹوک بات کہہ سکے ہیں۔ ظفر اوگانوی نے اپنی متذکرہ کتاب (صفیر بلگرامی بحیثیت غزل گو) میں نثر میں ۱۴ راور نظم میں ۱۶ رتصانیف کا ذکر کیا ہے۔ اسی لیے مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''صفیر کی تصانیف کی کوئی مکمل فہرست تیار کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ تصانیف کی بڑی تعداد طباعت سے محروم رہی اور جو تصانیف مسودوں کی صورت میں تھیں، ان میں سے بہت سی ضائع ہو گئیں۔ مطبوعہ تصانیف بھی کمیاب ہیں۔ اس لیے یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ صفیر کی کتنی تصانیف طبع ہوئیں۔'' (۴)

صفیر بلگرامی ایک قادر الکلام شاعر تھے، ان کا شعری منہاج کلاسیکی تھا۔ انھیں دبیر و ناسخ ہی نہیں، غالب جیسے نام ور سخن ور کی شاگردی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا اور انھوں نے اپنے اشعار میں غالب کے رنگ غزل کی پیروی کی تھی۔ انھوں نے دلی اور لکھنؤ دونوں ادبی دبستانوں کا رس کشید کیا تھا مگر غالب کا انداز تربیت اور اصلاح سخن کا عمل دوسرے اساتذہ سے ذرا

مختلف تھا۔ غالب اپنی علمیت کا طومار نہیں باندھتے تھے اور نہ ہی کسی کی حوصلہ شکنی کے روادار تھے۔ وہ اپنے پاس بھیجی گئی غزلوں کی صرف نحوی اور فنی اغلاط و اسقام تک اصلاح کر کے اپنے شاگردوں اور مستفیدین کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ غالب ماہر نفسیات اور طبیعت شناس شخص تھے، انھیں یہ بات معلوم تھی کہ ہر شخص کا جس طرح چہرہ مہرہ مختلف ہوتا ہے، اسی طرح اس کا ذوق اور فطری صلاحیت بھی مختلف انداز و اطوار کی حامل ہوتی ہے۔ یوں بھی ایک نومشق و نوآموز پر کسی استاد شاعر کا رنگ سخن چڑھانا بڑا مشکل کام ہے، مگر غالب کی مختصر عرصہ پر محیط شاگردی نے بھی صفیر کے لیے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور وہ اپنے عہد کے ایک اہم غزل گو شاعر کے طور پر ابھرے۔ تاہم ان کی شاعری پر غالب کا رنگ ذرا کم چڑھا ہے کہ وہ دلی سے زیادہ لکھنؤ کی طرف میلان رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی بجا لکھتے ہیں:

''صفیر نے براہ راست غالب سے کسب فیض کیا، ملاقات و مراسلت کا سلسلہ بھی رہا۔ مگر مزاجوں کا فرق، رنگ غزل میں بہرحال حائل رہا۔ اس سے صفیر کی عظمت پر حرف نہیں آتا ہے بلکہ اس سے اس کاوش خلوص کا پتہ چلتا ہے جو اس دور کا خاصہ رہا ہے۔''(۵)

صفیر نے نام و نمود کے لیے نہیں بلکہ بڑے اشتیاق سے دربار غالب میں باریابی حاصل کی تھی، کئی ماہ ان سے استفادہ کا سلسلہ چلتا رہا، غالب بھی انھیں حد درجہ عزیز رکھتے تھے، مگر ان پر غالب کا رنگ کیوں نہیں چڑھ سکا، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صفیر کا شاعرانہ ذہن صنعت پسندانہ اور پرتکلف تھا۔ ان کے صناع ذہن میں غالب کی فلسفہ بافیاں کس طرح سما سکتی تھیں۔ اسی بنا پر غالب کی اصلاح کے بعد بھی صفیر کی شاعری ''غالبیت'' سے دور دور رہی۔ اور غالب و صفیر میں شاعرانہ حیثیت سے کوئی تطابق پیدا نہیں ہو سکا۔ صفیر پر ہی کیا منحصر ہے غالب کا کوئی بھی شاگرد غالب کی بنائی ہوئی روش پر نہیں چل سکا۔''(۶)

پھر بھی بالکلیہ نہیں کہا جا سکتا کہ صفیر بلگرامی اور غالب میں مشابہت کے عناصر بہت کم یا برائے نام ہیں۔ صفیر نے بڑی محنت سے غالب کے رنگ سخن کی تقلید کی ہے۔ صفیر کے جن اشعار پر غالب کا رنگ نظر آتا ہے، ان میں سے چند یہاں بطور مثال درج کیے جا رہے ہیں، مگر انھیں مکمل غالب کے رنگ کا شعر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بال کی کھال نکالنے کے مصداق ان کے درمیان مقابلہ و موازنہ کیا جائے اور اس کی فلسفیانہ موضوعی تشریح کی جائے، کہیں الفاظ میں مشابہت ہے تو کہیں مضامین میں، پہلا شعر غالب کا ہے اور دوسرا صفیر بلگرامی کا:

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا (غالب)

دار الشفائے عشق کی ہے رسم و راہ اور
اچھا وہی رہا کہ جو اچھا نہ ہو سکا (صفیر)

غالب کا مشہور زمانہ شعر ہے:

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان، غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اس کے دوسرے مصرع سے استفادہ کرتے ہوئے صفیر نے مقطع کا یہ شعر کہا:

تیرے انجام کا قلق ہے صفیرؔ
کاش تو مرد پارسا ہوتا

غالب نے متضاد و متصادم الفاظ سے اپنی شاعری کو سجایا سنوارا ہے کہ اس سے قاری کا ذہن مختلف اور متضاد سمتوں میں سفر کرنے لگتا ہے اور وہ تضاد و تصادم کی کیفیت سے سرشار ہونے لگتا ہے، صفیر نے بھی شاید اپنے استاد کے تتبع میں ہی کچھ ایسے الفاظ اپنی اردو غزلوں میں برتے ہیں، جو باہم تضاد و تصادم کی کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ دیکھیے صفیر بلگرامی کے یہ اشعار، جس میں ایک ہی مصرع میں متضاد الفاظ کی جلوہ گری ہے:

کل جو اٹھتے تھے، بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں، اٹھانے کے لیے

بھلا، تم تو بھلے ہو، میں برا ہوں
محبت جھوٹ، میرا چاہنا جھوٹ

اور اس شعر کا مضمون، صاف غالب کے اس شعر کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس میں غالب نے ناصح و واعظ کو وعظ و نصیحت اور پند و موعظت سے منع کیا ہے:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

دیکھیے صفیر اس شعر کے مضمون کو کس طرح اپنی غزل کے پیمانے میں ڈھالتے ہیں:

قابو میں دل نہیں ہے، بھلا آپ کس لیے
تسکین دیتے ہیں مجھے، سمجھائے جاتے ہیں

اور یہ شعر صفیر نے غالب کے اس مشہور زمانہ شعر سے متاثر ہو کر ہی کہا ہوگا:

معلوم کچھ نہیں ہے کہ پھر ہم کہاں رہے
مرنے کے بعد بھی نہ پریشانیاں گئیں (صفیر)

ہوئے مرکے جو ہم رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا(غالب)

یہی کیا،صفیر نے تو ایک پوری غزل غالب کی زمین ''خفیف مسدس مخبون محذوف مقطوع''یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلن (کوئی امید بر نہیں آتی- کوئی صورت نظر نہیں آتی...الخ) میں کہہ ڈالی ہے اور بہت سے مضامین کا بھی بانداز دگر اعادہ کیا ہے کہ اگر ان اشعار کو غالب کی اس غزل کے اشعار میں بلا تنبیہ خلط ملط کردیا جائے، تو دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوجائے۔صفیر کی اس غزل کے یہ اشعار دیکھیں:

آہ اب ہونٹوں پر نہیں آتی
ہائے دل کی خبر نہیں آتی
کس طرح ہوگا وصل اے اللہ
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور یہ شعر بھی اپنی معنویت و کیفیت میں بے مثال ہے،جس پر غالب کے ایک شعر کا اثر ہے اور بحر و وزن میں بھی یکسانیت ہے، پہلے صفیر کا شعر اور پھر غالب کی غزل کا وہ مشہور شعر:

ہم ہیں مجبور اور تم مختار
اے بتو!یہ خدا کی قدرت ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے

اس فرق و مشابہت کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ صفیر کی غزلوں کی لفظیات اور بنیادی ساخت عہد کلاسیکیت کی آئینہ دار ہے، گرچہ ان کے یہاں دلی کا تغزل اور سوز و گداز نہیں ہے، مضامین پر بھی داخلیت کے بجائے خارجیت کی حکمرانی ہے، مگر صفیر کی لفظیات و تشبیہات بیش تر وہی ہیں، جو میر و سودا اور غالب و درد کی لفظیات و تشبیہات سے میل کھاتی ہیں، مضامین و مواد میں بھی کہیں کہیں یکسانیت ملتی ہے، صفیر نے اپنے متقدمین میر تقی میر وغیرہ کی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی، مگر ''نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب''۔ کوشش کے باوجود ان کی غزلوں میں میر کا رنگ و آہنگ پیدا نہ ہوسکا۔ وہی عشق و عاشقی، وصال و فراق صنم، مجبوری کا درد اور چھیڑ چھاڑ والا انداز، مگر صفیر کا انداز سخن ان تمام مشابہتوں کے باوجود منفرد ہے کہ وہ شاعری کے تمام رنگوں کا عطر کشید کر چکے تھے۔ان کی روایت پسندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظفر اوگانوی بھی لکھتے ہیں:

''ان[صفیر] کے یہاں وہی روایت پسندی، وہی گل و بلبل، وہی زلف و رخسار، وہی موہوم کمر، خنجر ابرو، گیسوئے سیاہ، قد رعنا اور معشوق کے عامیانہ جور و ستم ملتے ہیں۔''(۷)

صفیر نہ صرف ممتاز غزل گو تھے، بلکہ برجستہ ادبی نثر بھی لکھا کرتے تھے اور اپنے استاد گرامی غالب کی طرح ہی بڑی جرس طبیعت بھی پائی تھی۔اپنی نثر اور خطوط میں بھی صفیر نے غالب کے نقش قدم کو ٹٹولا ہے۔وہ واقعات اور مشاہدات کے ایک ایک کردار، حرکات و اعمال، تمام اجزا اور شوشہ گوشہ کو باریک بینی سے قلم بند کرتے ہیں، گویا وہ نہ صرف اپنی غزلوں میں، بلکہ نثر میں بھی غالب کا انداز و آہنگ اپنا رہے تھے۔وہ غالب کی مکالماتی نثر سے واقف بھی تھے۔جلوۂ خضر میں یہ لکھا ہے:

''تاثیر در نثر کے موجد اردو میں اول استاد نا حضرت غالب علیہ الرحمہ گنے جاتے ہیں کہ انھوں نے بعد ترک تحریر فارسی اردو میں لکھنے کی وضع ایسی نکالی کہ گویا مکتوب الیہ سے باتیں کرتے ہیں۔''(۸)

جب وہ دہلی غالب سے بغرض ملاقات گئے تھے، اس یادگار سفر اور وہاں کے پیش آمدہ واقعات کا بیان خود صفیر کے الفاظ میں پڑھیے، اس خط میں صفیر کی سراپا نگاری، قصہ گوئی کی صلاحیتوں اور جزئیات و جذبات نگاری کا بھی اندازہ ہوگا اور یہ بھی کہ وہ گرچہ شاعری کے معاملے میں لکھنوی انداز و اظہار کے پرستار تھے، مگر وہ نثر میں پیروی غالب کو ہی مقدم رکھتے تھے:

''حضرت[غالب] کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا۔آموں کا موسم تھا۔نانا صاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کردیئے۔میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔شب جمنا پار لال قلعہ کے نیچے بسر کی۔صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلّۂ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔حضرت برآمدہ میں بیٹھے کلی پی رہے تھے۔ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے۔دیکھ کر بشاش ہوگئے۔اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا۔پوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے عرض کی صفیر۔ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا۔بولے ذرا ٹھہر جایئے۔یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے اور بغل گیر ہوئے اور برآمدہ سے اندر آکر بیٹھے۔گرمی کے دن تھے۔صفر کا مہینہ تھا۔حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا۔پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار، نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر داڑھی دوانگلی کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہوکر اینٹھ گئی تھیں

اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا۔(۹)

صفیر بلگرامی نے اپنی نثر میں غالب کی طرح ہی چھوٹے چھوٹے جملے لکھے ہیں، جن میں برجستگی اور بے ساختگی ہے اور ان پر ڈرامائی شان کا گمان ہوتا ہے۔ دیکھیے اسی خط میں اپنے سفر کے مشاہدات کو کس طرح بیان کرتے ہیں:

''ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا۔ وہ میلہ بھی قابل دید تھا، دہلی میلہ کا کیا کہنا ہے۔ میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری بھی خوب کی۔ جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔ تبرکات کی زیارت کی۔ جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دست مبارک کے قرآن لکھے ہوئے دیکھے، خط کوفی میں تھے۔ چوک کی سیر روز کرتا تھا۔ بازاروں میں روز پھرتا تھا، مگر دہلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں۔ چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو۔ کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو۔''(۱۰)

صفیر اور غالب کے درمیان استادی اور شاگردی کا زمانی عرصہ بھی بحث خیز موضوع رہا ہے۔ کسی نے چھ ماہ تو کسی نے اس عرصہ کو دو ڈھائی ماہ تک محدود کر دیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے تاریخ ادب اردو جلد اول میں صفیر کے دہلی میں زمانۂ قیام کا عرصہ چھ ماہ لکھا ہے۔ ویسے نامور محقق اور ماہر غالبیات مالک رام کی تحقیق درج ذیل ہے، جو درست بھی ہے، کیوں کہ خود صفیر نے ''جلوۂ خضر'' کی دوسری جلد میں یہ جملہ ''میں حضرت غالب کی ملازمت کے لیے دہلی گیا اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا'':

''صفیر نے غالب سے بہت کم استفادہ کیا۔ وہ غالباً مئی ۱۸۶۴ء میں غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ کوئی سال بھر بعد جون ۱۸۶۵ء میں وہ دلی آ کر غالب سے ملے اور دو ڈھائی مہینے یہاں رہے اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔''(۱۱)

غالب کے بہت سے شاگرد ہوئے، چند محققین نے ان کے تلامذہ کی کل تعداد دو سو بتائی ہے، سب ایک سے بڑھ کر ایک نام ور اور شعر و سخن کی دنیا کے شہسوار، مگر صفیر بلگرامی غالب کے تمام تلامذہ میں اس لیے منفرد تھے کہ وہ نہ صرف نظم و نثر کی تمام مروجہ اصناف پر قادر تھے، بلکہ وہ ان چند تلامذۂ غالب میں سے تھے، جن سے ایک عرصے تک ان کے مستفیدین کا معنوی سلسلہ قائم رہا ہے۔ نام ور محقق مالک رام مشفق خواجہ کی کتاب پر دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''غالب کے تقریباً دو سو شاگردوں میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کئی حیثیتوں سے بہت نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے، نظم و نثر پر یکساں قادر تھے۔ نظم و نثر کی کئی اصناف میں انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان دو تین شاگردوں میں سے ہیں، جن سے غالب کا معنوی سلسلہ آج تک قائم ہے۔''(۱۲)

صفیر بلگرامی اپنے وقت کے جبل العلم تھے، امام فن تھے، ان کا شعری و ادبی سرمایہ اتنا وقیع ہے کہ ان پر سیکڑوں تحقیقی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ صفیر کی ادبی شخصیت بہت ہمہ گیر تھی۔ انھیں اردو کی تمام اصناف پر ید طولیٰ حاصل تھا، مگر انھیں نہ صرف متقدمین نے نظر انداز کیا، بلکہ عہد حاضر کے محققین نے بھی پشت دکھا دی۔ نام ور محقق سیدہ جعفر نے بھی اپنی کتاب 'تاریخ ادب' میں ان سے اعراض و اغماض برتا۔ یہ المیہ ہے کہ اتنے قاموسی اور بین العلومی شاعر و نثر نگار کو اردو شعر و ادب میں زیادہ قدر دانی نہیں ملی۔ صفیر بلگرامی کے عدم اعتراف کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ان کے خانوادے کے افراد پاکستان منتقل ہو گئے اور ان کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ ادبی سرمایہ بھی اپنے ہمراہ لیتے گئے، مگر اس سے بھی بڑی وجہ ناقدین و محققین کا ان کے فن کی طرف عدم میلان تھا۔ ظفر اوگانوی نے صفیر شناسی کے اسی جذبے کے تحت ان کی شاعری اور ادبی خدمات کو اپنی ریسرچ کا موضوع بنایا تھا اور صفیر بلگرامی کے ادبی ورثہ اور شعری سرمایہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کی تلاش میں سرحد پار تک کا سفر کیا تھا۔ ظفر اوگانوی کا یہ کام ہندوستان کی حد تک واحد تحقیقی کام ہے، جس سے صفیر کی شخصیت اور شعری نقوش بڑی حد تک اجاگر ہو جاتے ہیں۔

حواشی و حوالے

۱۔ صفیر بلگرامی: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر ظفر اوگانوی، ص:۷، اقدار کتاب گھر، کلکتہ، ۱۹۷۶ء

۲۔ نقوش لاہور، آپ بیتی نمبر، حصہ اول، مدیر محمد طفیل، فرید بک ڈپو نئی دہلی، ۲۰۱۴ء

۳۔ صفیر بلگرامی: بحیثیت غزل گو، ص:۲۹، بک امپوریم پٹنہ، ۱۹۸۴ء

۴۔ غالب اور صفیر بلگرامی، ص:۳۱، مشفق خواجہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۵۔ صفیر بلگرامی: بحیثیت غزل گو، ص:۹

۶۔ ایضاً، ص:۳۸ ۷۔ ایضاً، ص:۳۵

۸۔ غالب اور صفیر بلگرامی، ص:۱۲۹

۹۔ ایضاً، ص:۱۰۰ ۱۰۔ ایضاً، ص:۱۰۵

۱۱۔ دیباچہ غالب اور صفیر بلگرامی

۱۲۔ دیباچہ طبع دوم، غالب اور صفیر بلگرامی، ص:۷

◆◆◆